

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۝ کی تفسیر

قارئین کرام! سورۃ القیامہ کی آیات (۱۶-۱۹) میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو یہ تعلیم دی تھی کہ جبریل کے آپ کی طرف وحی کرنے کے وقت آپ بھول جانے کے اندیشے سے جلدی جلدی نہ پڑھا کریں، بلکہ جب جبریل وحی مکمل پہنچا چکیں تو آپ پڑھیں، وحی کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے، وہ اسے ضائع نہیں ہونے دے گا۔

قرآن کریم کے الفاظ بھی یہی بتاتے ہیں اور صحیح بخاری میں موجود سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث بھی ان آیات کی یہی تشریح کرتی ہے، صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ دین، سب نے اجماعی طور پر یہی تفسیر کی ہے، چودہ سو سال تک کسی مسلمان نے اس تفسیر کو غلط نہیں کہا، آپ کسی مسلمان کی لکھی ہوئی کوئی بھی تفسیر اٹھائیں، ان آیات کی یہی تفسیر آپ کو ملے گی، لیکن چودہ سو سال کے تمام مسلمانوں کو معاذ اللہ ”عقل و فہم سے بے بہرہ، بے وقوف اور نہایت غیر عاقلانہ طرز کار کے حامل“ قرار دے کر شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب نے اس حدیث اور اس تفسیر پر بہت سے بے تنکے، جاہلانہ اور آوارہ اعتراضات کیے ہیں، بھلا کوئی اس سے پوچھتے کہ چودہ سو سال میں کیا کوئی بھی اتنی سوچ بوجھ والا انسان پیدا نہیں ہوا؟

در اصل یہ لوگ چاہتے ہیں کہ حدیث پر اعتراضات کر کے اس کی دینی حیثیت کو مشکوک بنا دیا جائے اور پھر قرآن کی من مانی تفسیر و تشریح کرتے ہوئے اصل اسلام کو ختم کیا جائے اور اسلام کا لیل بھی قائم رہے۔

افسوس کی بات ہے کہ یہ باطنی و رافضی صاحب قرآن کریم میں بھی عربیت کے لحاظ سے غلطیوں کے وجود کا دعویٰ دار ہیں (دیکھیں) «صحیح بخاری کا مطالعہ» : ۷۳/۱، لیکن پھر بھی بعض جاہل لوگ انہیں ”مفسر قرآن“ سمجھتے ہیں اور ان کی نام نہاد تفسیر ”مفتاح القرآن“ کو بڑا علمی خزانہ سمجھتے ہیں۔

آئیے صحیح بخاری کی اس صحیح حدیث پر ساری امت کے اتفاق کے خلاف انہوں نے جو کاوش کی ہے، اس کا علمی، تحقیقی اور عقلی جائزہ لیتے ہیں:

اعتراض نمبر ① : ”ابوعوانہ راوی نے جس کا نام وضاح بن عبداللہ بشاری ہے،

یہ حدیث موسیٰ بن ابی عائشہ سے سنی تھی، موسیٰ بن ابی عائشہ کا بیان ہے کہ یہ حدیث بیان کرتے ہوئے عبداللہ

ابن عباس نے سعید بن جبیر سے فرمایا تھا کہ دیکھو، میں تمہیں اپنے ہونٹ ہلا کر دکھاتا ہوں، جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ آغازِ امر میں حضرت جبرئیل کے ساتھ ایک ایک لفظ پڑھتے ہوئے ہونٹ ہلاتے تھے اور سعید ابن جبیر نے موسیٰ بن ابی عائشہ سے کہا کہ دیکھو، میں تمہیں اپنے ہونٹ ہلا کر دکھاتا ہوں، جیسے عبد اللہ بن عباس نے مجھے اپنے ہونٹ ہلا کر دکھائے تھے، اس پر یہ بجا یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباس نے رسول اللہ ﷺ کے مقدس لبہائے مبارک جبرئیل کے ساتھ ساتھ لفظ لفظ پڑھنے کی وجہ سے ہلتے ہوئے کب دیکھے تھے؟ جب سورۃ القیامہ نازل ہوئی ہے تو ابن عباس پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، حضور اکرم ﷺ نے جب مکہ سے ہجرت فرمائی ہے تو ابن عباس اپنی عمر کے تیسرے سال میں تھے، انہیں ہوشمند ہونے کے بعد پہلی بار حضور اکرم ﷺ کو دیکھنے کا موقع ذی قعدہ سات ہجری میں میسر ہوا تھا، جب آپ عمرۃ القضا کے لیے مکہ تشریف لے گئے تھے اور اس روایت کے بموجب رسول اللہ ﷺ کا وحی اخذ کرتے ہوئے ہونٹوں کو ہلانا نبوت کے ابتدائی دور کی بات ہے، جسے عبد اللہ بن عباس نے یقیناً نہیں دیکھا، کیونکہ وہ پیدا ہی نہیں ہوئے تھے، پھر عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سعید بن جبیر سے یہ کیسے کہہ سکتے تھے کہ اَنَا أَحَرَّ كَهْمَا لَكَ كَمَا كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحْرُكُهُمَا ... (میں تمہیں اپنے ہونٹ ہلا کر دکھاتا ہوں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اپنے ہونٹ ہلایا کرتے تھے)، ہرگز نہیں، ہمیں یقین ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس نے سعید بن جبیر سے یہ نہیں کہا تھا اور غالباً سعید بن جبیر نے بھی موسیٰ بن ابی عائشہ سے یہ فضول اور غلط بات نہیں کہی ہوگی۔۔۔ بلکہ یہ خود موسیٰ بن ابی عائشہ کا ہی طبعزداد اضافہ ہے۔۔۔» («مطالعہ»: ۱۸/۱۹)

(جواب): قارئین کرام! یہ اعتراض حدیث اور اصول حدیث سے ناواقفیت یا محض ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہے۔

① بات اتنی سی ہے کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ حدیث اس وقت نبی کریم ﷺ سے نہیں سنی تھی، بلکہ بعد میں نبی کریم ﷺ نے ان کو سورۃ القیامہ کی تفسیر سمجھاتے ہوئے اپنا یہ واقعہ سنایا تھا اور وہ کیفیت دکھائی تھی، جسے آپ ان آیات کے نزول سے پہلے اختیار کیا کرتے تھے۔

مستخرج ابی نعیم میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے یہ صریح الفاظ ہیں: رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحْرُكُ شَفْتَهُ. ”میں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنا ہونٹ ہلاتے ہوئے

دیکھا۔“ (المسند المستخرج على صحيح الامام مسلم لأبي نعيم الأصبهاني: ٦٨/٢، وسنده صحيح)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ: یہی اعتراض نقل کر کے جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں: لکن يجوز أن يكون النبي صلى الله عليه وسلم أخبره بذلك بعد أو بعض الصحابة أخبره أنه شاهد النبي صلى الله عليه وسلم، والأول هو الصواب، فقد صريحاً في مسند أبي داود الطيالسي ...

”ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بعد میں خود ان کو یہ بیان کیا ہو یا کسی اور صحابی نے ان کو بتایا کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا، لیکن پہلی بات (کہ خود رسول اللہ ﷺ نے ان کو بعد میں بتا دیا تھا)، کیونکہ مسند ابی داؤد طیالسی میں یہ صریح طور پر ثابت ہے۔“ (فتح الباری لابن حجر: ٢٩/١)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما مفسر قرآن ہیں اور تفسیر انہوں نے رسول کریم ﷺ سے حاصل کی ہے، کیا یہ بات سمجھ میں نہ آنے والی ہے کہ آپ ﷺ نے ان آیات کی تفسیر بتاتے وقت ان کو وہ کیفیت بتادی تھی؟

② اگر کوئی اس بات کو نہ مانے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کو یہ کیفیت بتائی تھی، تو بھی اس حدیث میں کوئی عیب و قدح اور ضعف پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ صحابہ کرام جب ایسی حدیث بیان کریں جو انہوں نے ڈائریکٹ نبی کریم ﷺ سے سنی نہ ہو تو وہ لازماً کسی دوسرے صحابی سے سن کر بیان کر رہے ہوتے ہیں اور اسے اصطلاح محدثین میں ”مرسل صحابی“ کہتے ہیں اور یہ عام ”مرسل“ حدیث کی طرح ”ضعیف“ نہیں، بلکہ محدثین کے نزدیک مقبول ہے، حافظ ابن صلاح رحمہ اللہ (۱) فرماتے ہیں:

ثم أنا لا نعد في أنواع المرسل ونحوه ما يسمى في أصول الفقه مرسل الصحابي، مثل ما يرويه ابن عباس وغيره من أحداث الصحابة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم ولم يسموه منه، لأن ذلك في حكم الموصول المسند، لأن روايتهم عن الصحابة، والجهالة بالصحابي غير قاذحة، لأن الصحابة كلهم عدول ...

”پھر یہ بھی یاد رہے کہ ہم (محدثین) اس حدیث کو مرسل وغیرہ کی اقسام میں شمار نہیں کرتے جسے اصول فقہ میں مرسل صحابی کا نام دیا جاتا ہے، جیسا کہ وہ احادیث جن کو سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ان جیسے دوسرے کم سن صحابہ رسول اللہ ﷺ سے بیان کرتے ہیں، حالانکہ انہوں نے وہ احادیث آپ ﷺ سے نہیں سنی ہوتیں، (ہم ان کو ضعیف قرار نہیں دیتے) کیونکہ یہ موصول اور مسند حدیث کے حکم میں ہوتی ہیں، وجہ یہ ہے کہ کم سن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم (دیگر کبار) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ہی روایت کرتے ہیں اور صحابی کا معلوم نہ ہونا

(حدیث کی صحت میں) عیب نہیں، اس لیے کہ سارے صحابہ عادل ہیں۔“ (مقدمۃ ابن الصلاح: ۳۷۱)

حافظ نووی رحمہ اللہ (م ۶۷۶ھ) لکھتے ہیں: اَنَّ مَرْسِلَ الصَّحَابِيِّ حِجَّةٌ عِنْدَ جَمِيعِ الْعُلَمَاءِ ...

”بلاشبہ مرسل صحابی سب علمائے کرام کے نزدیک حجت ہے۔“ (شرح صحیح مسلم: ۱۹۷/۲)

نیز لکھتے ہیں: اَنَّ مَرْسِلَ الصَّحَابِيِّ اِذَا لَمْ يَعْرِفِ الْمَحْذُوفُ يَكُونُ حِجَّةً ...

”یقیناً جب محذوف راوی معلوم نہ ہو سکے تو (بھی) مرسل صحابی حجت ہوتی ہے۔“

(شرح صحیح مسلم: ۱۹۸/۱)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اَنَّ الْجُمْهُورَ جَعَلَهُ حِجَّةً . ”بے شک جمہور علمائے

کرام نے اسے (مرسل صحابی کو) حجت بنایا ہے۔“ (النکت علی کتاب ابن الصلاح: ۵۸۵/۲)

معلوم ہوا کہ میرٹھی صاحب کا یہ اعتراض اصطلاحات محدثین سے جہالت کا کرشمہ ہے، اور ان کا یہ کہنا نہایت فضول اور بے جا ہے کہ: ”ابن عباس نے واقعاً یہ بات کسی سے بھی نہیں سنی، نہ خود حضور اکرم ﷺ سے، نہ کسی صحابی سے، ورنہ وہ ضرور بتاتے کہ مجھے یہ بات فلاں سے معلوم ہوئی تھی۔“ (»مطالعہ«: ۱۹/۱: ۲۰)

جاہلی کلابازیاں : قارئین کرام! آئیے سب مسلمانوں کے نزدیک قابل

احترام بزرگ ہستیوں کو ”عقل و فہم سے بے بہرہ“ اور ”بے وقوف“ قرار دینے والے صاحب کی اپنی عقلی کیفیت ملاحظہ فرمائیں کہ وہ خود کیسے جہالت اور بے وقوفی میں کلابازیاں کھاتے پھرتے ہیں:

آپ اعتراض نمبر ① میں میرٹھی صاحب کے یہ الفاظ پڑھ چکے ہیں کہ: ”یہ خود موسیٰ بن ابی عائشہ کا ہی طبع زاد اضافہ ہے۔۔۔“ لیکن ان کی کلابازی دیکھیں کہ اگلے ہی صفحہ پر لکھتے ہیں:

”تو کیا سعید بن جبیر نے یہ غلط بیانی کر ڈالی تھی اور یہ قصہ گھڑ لیا تھا؟ نہیں، وہ نیک و ثقہ شخص تھے، کذاب و دروغ باف نہ تھے، بات یہ ہوئی کہ کسی شخص نے حضرت ابن عباس کی طرف منسوب کر کے سعید بن جبیر سے یہ حدیث بیان کر دی تھی، سعید نے غور و فکر سے کام نہ لیا، اس شخص پر اعتماد کر کے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کر کے یہ حدیث روایت کر ڈالی۔“ (»مطالعہ«: ۲۰/۱)

دیکھا آپ نے کہ پہلے موسیٰ بن ابی عائشہ پر الزام دھرا کہ انہوں نے اپنی طرف سے اسے گھڑا تھا، حالانکہ وہ نہایت ثقہ و عادل تابعی تھے اور ان لوگوں میں سے تھے جن کو دیکھنے سے اللہ یاد آجاتا ہے (تہذیب الکمال:) لیکن ”دروغ گورا حافظہ نہ باشد“ کا مصداق بن کر ایک ہی صفحہ بعد پینتر بدلا اور خود ساختہ

مفروضہ کے تحت کسی فرضی شخص کو مورد الزام ٹھہرا دیا ہے۔

یہ بھی ایک الگ بحث ہے کہ خود انہی کی ذکر کردہ حدیث بخاری میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ حدیث سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ڈائریکٹ سنی تھی، جیسا کہ ہم اعتراض نمبر ⑤ کے جواب میں تفصیلاً ذکر کریں گے۔ انشاء اللہ!

اسی پر بس نہیں، ابھی گرگٹ کی طرح ان کا تیسرا رنگ بھی دیکھیں کہ یہاں تو سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ جو جلیل القدر تابعی ہیں، ان نیک وثقہ اور جھوٹ سے مبرا قرار دے رہے ہیں، لیکن اسی کتاب میں دوسری جگہ اسی نیک وثقہ اور عظیم المرتبت امام کے بارے میں ان کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں، لکھتے ہیں:

”سعید (بن جبیر) نے بے سوچے سمجھے اسے روایت کر دیا، کیونکہ ان راویانِ اخبار کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کفی بالمرء کذباً أن يحدث بكل ما سمع (آدمی کو (تباہی کے لیے) یہی جھوٹ کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بیان کر دے) کی پرواہ نہ تھی، بس اپنے علامہ ہونے کا ثبوت دینے کے لیے روایات بیان کرتے رہتے تھے۔“ (مطالعہ: ۳۳۰/۲)

قارئین کرام! ایمان و انصاف سے بتائیں کہ جس شخص کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین کی پرواہ نہ ہو اور جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احادیث اپنے علامہ ہونے کا ثبوت دینے کے لیے بیان کرتا ہو، وہ کیسا ثقہ و نیک ہے؟ یہ ہیں اس عظیم تابعی اور ثقہ امام کے بارے میں ان کے تاثرات، جن کو حافظ ذہبی جیسا ناقدرِ رجال شخص بہت سے القابات سے نوازتے ہوئے لکھتا ہے: الامام، الحافظ، المفسر، الشهيد.... أحد الأعلام،

روى عن ابن عباس، فاكثرو وجود.... قرأ القرآن على ابن عباس... (آپ) امام، حافظ، مفسر، شہید۔۔۔ جلیل القدر علمائے اسلام میں سے ایک ہیں، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آپ نے بہت زیادہ روایات کی ہیں اور بہت عمدہ کی ہیں۔۔۔ انہوں نے قرآن کریم بھی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی پڑھا تھا۔“ (سير اعلام النبلاء: ۳۵۵/۷)

ہم نے مقدمہ میں ہی آپ کو بتا دیا تھا کہ یہ صاحب ایک ایک محدث کی شان میں گستاخی کر کے مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں اور آپ ان کا یہ فعل شنیع ملاحظہ کرتے ہی رہیں گے۔

”سعید بن جبیر نے بہت سی حدیثیں حضرت عبداللہ بن عباس ⑤ :
 سے براہِ راست سنی تھیں اور بہت سی حدیثیں دیگر اشخاص نے انہیں ابن عباس کی طرف منسوب کر کے بتائی

تھیں، سعید نے ہر دو قسم کی حدیثوں کی روایت کی ہے، مگر جب وہ پہلی قسم کی کوئی حدیث روایت کرتے جسے موصوف نے براہ راست ابن عباس سے سنا ہوتا تو حدثنیٰ ابن عباس یا سمعت ابن عباس یا أخبرنی ابن عباس کہہ کر بیان کرتے تھے اور دوسری قسم کی کوئی حدیث روایت کرتے ہوئے یا تو اس شخص کا نام بتاتے، مثلاً حدثنیٰ عکرمہ عن ابن عباس یا حدثنیٰ مجاہد عن ابن عباس یا اس شخص کا نام ذکر نہ کرتے، بس عن ابن عباس کہہ دیتے، یہ حدیث بھی اسی قسم کی ہے، اس کے کسی بھی طریق میں سعید بن جبیر سے کوئی ایسا لفظ مروی نہیں جس سے ثابت ہو کہ سعید نے یہ قصہ براہ راست حضرت ابن عباس سے سنا تھا، ہر طریق کی اسناد میں سعید بن جبیر عن ابن عباس ہے۔۔۔ لیکن کسی بھی روایت میں یہ مذکور نہیں کہ سعید نے حدثنیٰ یا أخبرنی یا سمعت یا أنبأنی ابن عباس کہا ہو، ہر طریق کی اسناد میں ہمیں عن ابن عباس ملتا ہے۔“ (مطالعہ: ۲۰۸: ۲۱)

(جواب: ۱) آئیے! اگر منکرین حدیث کو سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کے ”یہ قصہ براہ راست“ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے سننے پر دلالت کرنے والا کوئی لفظ ”کسی طریق“ میں نظر نہیں آیا تو ہم دکھلا دیتے ہیں، وہ ذرا اپنی آنکھوں سے انکار حدیث کی عینک اتار دیں اور میرٹھی صاحب کی ہی کتاب کھول کر صفحہ نمبر ۱۷ نکالیں اور ان ہی کی ذکر کردہ حدیث پڑھ لیں، انہی کے ذکر کردہ ”طریق“ میں یہ الفاظ موجود ہیں:

وقال سعيد : أنا أحرّكهما لك كما رأيت ابن عباس يحركهما ...

”سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے (اپنے شاگرد موسیٰ بن ابی عائشہ رضی اللہ عنہ سے) فرمایا، میں اسی طرح اپنے دونوں ہونٹوں کو حرکت دے رہا ہوں، جس طرح میں نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔“ مزے کی بات یہ ہے کہ خود میرٹھی صاحب یہی بات صفحہ نمبر ۱۸ پر ذکر کر چکے ہیں۔

پھر مسند احمد میں سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ بھی موجود ہیں: فقال لي ابن عباس ...

”سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے مجھے فرمایا۔۔۔۔“ (مسند الامام احمد: ۳۴۳/۱، وسندہ صحیح)

کیا اب بھی یہ واضح نہیں ہوا کہ اس حدیث کو سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے براہ راست سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے سنا تھا، درمیان میں کوئی واسطہ نہ تھا؟

② کوئی ہمیں بھی بتائے کہ میرٹھی صاحب کو کس ”جی“ کے ذریعے یہ معلوم ہوا ہے کہ سعید بن

جبیرؓ کبھی واسطہ گرا کر استاذ کا نام لیے بغیر سیدنا ابن عباسؓ سے بیان کر دیتے تھے، حالانکہ انہوں نے وہ احادیث سیدنا ابن عباسؓ سے سنی نہیں ہوتی تھیں، کسی محدث نے کہیں ایسا ذکر کیا ہو؟ اگر ایسا ہوتا تو بلاشبہ محدثین کو اس کا علم ہوتا، منکرین حدیث کو بھلا حدیث اور راویان حدیث کی کیا معرفت؟

③ ہاں! اسے شیطانی وحی یقیناً قرار دیا جاسکتا ہے، وہ کیسے؟ اس لیے کہ جھوٹ شیطان ہی کا شیوہ ہے، عکرمہ اور مجاہدؓ کو امام سعید بن جبیرؓ کا استاذ قرار دینا کائنات کا بدترین جھوٹ ہے، بلکہ امام مجاہدؓ تو ساتھی ہونے کے ساتھ ساتھ سعید بن جبیرؓ کے شاگرد بھی ہیں، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سعید بن جبیرؓ حدیثی مجاہد عن ابن عباسؓ کہیں؟

سنن ابی داؤد (۲۴۳۸) اور دیگر کتب حدیث میں مجاہدؓ تو سعید بن جبیرؓ سے حدیث بیان کر رہے ہیں، لیکن کسی حدیث میں امام سعید بن جبیرؓ مجاہدؓ یا عکرمہؓ سے بیان نہیں کر رہے، نیز کسی محدث نے عکرمہ اور مجاہدؓ کو سعید بن جبیرؓ کے اساتذہ میں ذکر نہیں کیا، اس کے برعکس مجاہدؓ کے اساتذہ میں امام سعید بن جبیرؓ کو امام سعید بن جبیرؓ کے شاگردوں میں مجاہدؓ کو ذکر کیا گیا ہے، اگر صرف حافظ مزنیؓ کی کتاب تہذیب الکمال کو ہی دیکھ لیا جاتا تو استاذوں، شاگردوں کا پتا چل جاتا اور اتنی بڑی جہالت و حماقت سے واسطہ نہ پڑتا، مگر صحیح بخاری سے نفرت نے ان کو اندھا کر دیا ہے، سوچنے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے!!!

③ حدیثی یا سمعت یا أخبرنی کے الفاظ کی شرط صرف ”مُس“ راویوں کے لیے لگائی جاتی ہے کہ جب تک وہ ان الفاظ کے ساتھ حدیث بیان نہ کریں، ان کی حدیث قبول نہیں ہوتی۔

حافظ ابن حجرؓ لکھتے ہیں: فحكم من ذكر من رجاله بتدليس أو ارسال أن تسبر أحاديثهم الموجودة عنده بالنعنة، فان وجد التصريح بالسماح فيها اندفع الاعتراض وألا فلا . ”پس حدیث کے جو راوی تدلیس یا ارسال کے ساتھ موصوف ہوں، ان (کی احادیث) کا حکم یہ ہے کہ جو احادیث ”عن“ کے ساتھ ہوں، ان کو پرکھا جائے، اگر ان میں سماع کی تصریح مل جائے تو اعتراض ختم ہو جائے گا، ورنہ نہیں۔“ (هدية الساری مقدمة فتح الباری: ۳۸۲)

جب کہ امام سعید بن جبیرؓ قطعاً ”تدلیس“ یا ”ارسال کثیر“ کے مرتکب نہ تھے، لیکن نہ جانے ان نام نہاد سکارلز نے کون سی کتاب میں پڑھ لیا ہے کہ ہر راوی سے سماع کی تصریح کا مطالبہ کیا جائے اور کہا جائے کہ

اس نے کہیں بھی حدثنی یا سمعت یا أخبرنی نہیں کہا؟
کوئی میرٹھی ہمیں بتائے کہ ان کے اس اصول کے مطابق کتنی احادیث بچیں گی، جن میں پوری سند سماع کی تصریح پر مشتمل ہے؟ یہ محض حدیث و محدثین دشمنی کا شاخسانہ ہے۔

اعتراض نمبر ③ : ”علاوہ بریں یہ حقیقت ہے کہ سعید بن جبیر کی بہ نسبت عکرمہ

اور مجاہد حضرت عبداللہ بن عباس سے زیادہ مستفید ہوئے ہیں اور ان کے ملازم صحبت رہے ہیں اور بھی بہت سے بندگانِ خدا نے ابن عباس سے حدیثیں اور آیاتِ قرآن کی تفسیریں سنی ہیں، لیکن سعید بن جبیر اس حدیث کی روایت میں متفرد ہیں، ان کے علاوہ کسی نے بھی ابن عباس سے اس قصہ کی روایت نہیں کی، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ حضرت ابن عباس نے یہ قصہ بیان نہیں کیا تھا، کسی نے خواخواہ اسے ابن عباس کی طرف منسوب کر کے سعید بن جبیر سے بیان کر دیا تھا اور سعید نے اس پر اعتماد کر کے اس کا نام بھی ذکر نہیں کیا اور بس ابن عباس کی طرف منسوب کر کے اس کی روایت کر دی۔“ (»مطالعہ«: ۲۷۸)

جواب: ① قارئین کرام! انصاف سے بتائیں کہ اگر ایک استاذ سے کئی شاگرد

پڑھتے ہوں تو کیا سب شاگرد ایک ہی جیسا علم حاصل کرتے ہیں، خصوصاً جبکہ موجودہ کلاس سسٹم نہ ہو، موجودہ نظام میں بھی سب شاگرد استاذ سے یکساں استفادہ نہیں کرتے، چہ جائیکہ اس دور میں جب ہر کوئی اپنے طور پر کسی استاذ سے علم حاصل کرتا تھا، واضح بات ہے کہ یہ اعتراض انتہائی فضول ہے۔

کیا سب احادیث سب صحابہ نے بیان کی ہیں، اب صحیح بخاری کی پہلی حدیث کو ہی لیں، جسے میرٹھی صاحب یقیناً صحیح سمجھتے ہیں، کیونکہ انہوں نے اسے چھیڑا تک نہیں، بلکہ پانچویں حدیث پر اعتراض کیا ہے۔

یہ حدیث صحابہ کرام میں سے صرف سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بیان کی ہے، کیا اس شخص کی بات درست ہوگی جو میرٹھی صاحب کی طرح یہ راگ الا اپنے لگے کہ:

”یہ حقیقت ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی نسبت سیدنا ابو ہریرہ، سیدنا ابن عمر، سیدنا ابن عباس، سیدہ

عائشہ۔۔۔ رضی اللہ عنہا رسول کریم ﷺ سے زیادہ مستفید ہوئے ہیں اور ان کے ملازم صحبت رہے ہیں اور بھی بہت سے صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے حدیثیں سنی ہیں، لیکن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اس کی حدیث کی روایت میں متفرد ہیں، ان کے علاوہ کسی صحابی نے بھی رسول اللہ ﷺ سے اس حدیث کی روایت نہیں کی، اس لیے میں

سمجھتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ حدیث بیان نہیں کی۔۔۔“

② حدیث کو پرکھنے کے لیے اصول محدثین کے ہی لاگو ہوں گے، محدثین میں سے کسی نے اس وجہ سے اس حدیث کو رد نہیں کیا، انکار حدیث کے علمبرداروں کو یہ حق کس نے دیا ہے؟ خود لکھتے ہیں:

”محدثین کی اصطلاح میں صحیح حدیث وہ ہے جس کی اسناد متصل ہو اور راوی سب کے سب ثقہ وضابط ہوں اور اس کی اسناد یا متن میں نہ کوئی شذوذ ہو، نہ کوئی علت ہو۔“ (مطالعہ: ۲۲/۸)

یہ تعریف خود میرٹھی صاحب نے ذکر کی ہے، اب قارئین ہی بتائیں کہ کیا اس میں یہ شرط موجود ہے کہ راوی کے دوسرے سب ساتھی بھی وہی حدیث بیان کریں تو تسلیم ہوگی؟

اعتراض نمبر ④: ”یہ تو اس میں اسناد کے لحاظ سے خامی ہے کہ اس کی اسناد متصل نہیں، بلکہ فی الواقع منقطع ہے، رہا اس کا متن تو اس میں دوزبردست خرابیاں ہیں، اول یہ کہ اس کی رو سے ضمیر غائب جو ان آیات میں سات بار آئی ہے لا تحرك به لسانك لتعجل به ☆ ان علينا جمعه وقرآنه ☆ فاذا قرأناه فاتبعه قرآنه ☆ ثم ان علينا جمعه وقرآنه ☆ قرآن کی طرف راجع ہے، حالانکہ سابقہ آیات میں قرآن کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ اس کی طرف ان ضمیروں کا راجع ہونا درست ہو، قرآن کی طرف یہ ضمیریں راجع ماننے کے لیے کوئی قرینہ چاہیے، لفظی ہو یا معنوی اور یہاں کوئی قرینہ نہیں ہے۔“ (صحیح بخاری کا مطالعہ: ۲۷۸-۲۷۹)

جواب: قارئین کرام! صحیح بخاری کی حدیث میں اسناد کے لحاظ سے جو ”خامیاں“ انہوں نے بیان کی تھیں، ان کا تجزیہ ہم نے آپ کے سامنے رکھ دیا ہے، فیصلہ آپ پر ہے، آئیے اب ان کی طرف سے متن میں بیان کی گئی پہلی ”خرابی“ کا جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ یہ منکرین حدیث کی عقل کی خرابی ہے یا (معاذ اللہ) حدیث کے متن کی۔

① جب ہم نے میرٹھی صاحب کی طرف سے کئے گئے اعتراض رفع کر کے اس کی سند کو بالکل صحیح ثابت کر دیا ہے تو ضمیر کے غلط لوٹنے کا اعتراض ہم پر نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ پر ہے، کوئی مسلمان یہ جرات نہیں کر سکتا کہ آپ ﷺ کی بات باسند صحیح پہنچ جانے کے بعد ایسے اشکال پیش کرے۔

② آج تک کے تمام مسلمان مفسرین سورۃ القیامہ کی تفسیر میں اس حدیث کو ذکر کرتے رہے ہیں، اگر میرٹھی صاحب کے ذہن میں آنے والا اشکال کوئی علمی حیثیت رکھتا ہوتا تو صحابہ، تابعین، تبع تابعین

اور ائمہ دین و محدثین کو ضرور معلوم ہوتا، وہ تو سب اس ضمیر کا مرجع قرآن کریم ہونا ثابت کرتے رہے ہیں، اگر یقین نہ آئے تو تفاسیر کا مطالعہ کر کے دیکھ لیں۔

درحقیقت یہ لوگ اس کاوش کے درپردہ سب اسلاف امت کی کردار کشی چاہتے ہیں، جیسا کہ وہ صریح طور پر بھی ان کو ”عقل و فہم سے بے بہرہ“ کہہ کر اس کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔

③ رہا قرینہ کا سوال تو علامہ آلوسی لکھتے ہیں: وَالضَّمِيرُ لِلْقُرْآنِ لِدَلَالَةِ سِيَاقِ الْآيَةِ نَحْوُ ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ ”یہ ضمیر قرآن کریم کی طرف لوٹ رہی ہے، کیونکہ آیت کا سیاق اس پر دلالت کر رہا ہے، جیسا کہ سورۃ القدر کی پہلی آیت میں بھی یہی ضمیر ہے۔۔۔“ (تفسیر روح المعانی)

علامہ ابن جزئی لکھتے ہیں: الضَّمِيرُ فِي بِهِ يَعُودُ عَلَى الْقُرْآنِ دَلَّتْ عَلَى ذَلِكَ قَرِينَةُ الْحَالِ ... ”بہ میں ضمیر قرآن مجید کی طرف لوٹی ہے، قرینہ حال اس پر دلالت کرتا ہے۔“ (تفسیر الکلبی)

یعنی آپ ﷺ اس وقت وحی کو جلدی جلدی پڑھ رہے تھے، اسی حالت میں یہ فرمان باری تعالیٰ نازل ہو گیا، آپ ﷺ کو تو معلوم ہو گیا کہ ان آیات میں ضمیر کس طرف لوٹ رہی ہے، پھر آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کو بھی حدیث کے ذریعے بتا دیا کہ کہیں اس کے بارے میں جھنجھلاہٹ کا شکار نہ ہوں۔

اس کی مثال یوں سمجھیں کہ کوئی خطیب تقریر کر رہا ہو اور دوران تقریر ہی وہ کسی کتاب کی طرف اشارہ کر کے کہہ دے کہ ”یہ مجھے دو۔“ اب سامنے بیٹھنے والوں کو تو اس بات کی سمجھ آ جائے گی اور ”یہ“ والی ضمیر کا مرجع بھی معلوم ہو جائے گا، لیکن بعد میں کوئی آدمی اس تقریر کی آڈیو ریکارڈنگ سن رہا ہو تو جب تک اسے صورت حال بتانہ دی جائے، سمجھ نہ پائے گا کہ اس ضمیر کا مرجع کیا ہے، بلکہ اپنے ذہن کے مطابق کبھی کچھ سوچے گا اور کبھی کچھ، اسی صورت حال سے بچنے کے لیے ان آیات کا سبب نزول رسول اللہ ﷺ نے بیان فرما دیا تھا، لیکن یہ وضاحت (حدیث) منکرین حدیث کو بھاتی نہیں اور وہ اعتراض کرتے رہتے ہیں۔

④ اگر میرٹھی کمپنی کی سمجھ میں اب بھی بات نہیں آئی تو سورۃ القدر کی پہلی آیت:

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ ”ہم نے اس (قرآن) کو لیلۃ القدر میں نازل کیا۔“

میں ضمیر کا مرجع بتائیں، پیچھے قرآن مجید کا ذکر نہیں ہے، بلکہ سورت شروع ہی ہو رہی ہے، جس طرح وہ اس آیت میں ضمیر کا مرجع قرآن کریم ثابت کریں گے، اسی طرح ہم اس آیت میں ثابت کر دیں گے۔

اعتراض نمبر ⑤ : ”دوم یہ کہ لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ کو

اس معنی و مطلب پر حمل کیا جائے جو اس حدیث میں مذکور ہے تو اسے کچھلی اور بعد کی آیتوں سے کوئی ربط نہیں رہتا اور قرآن تو بہت بڑی چیز ہے، ایسی بے ربطی تو کسی عقلمند انسان کے کلام میں بھی نہیں ہو سکتی۔۔۔

لہذا اصول حدیث کی رو سے یہ حدیث صحیح نہیں ہے، اگرچہ امام بخاری اور امام مسلم نے اس کی تخریج فرمائی ہے۔“ (»مطالعہ«: ۲۲/۸)

(جواب): ہم نے میرٹھی صاحب کو ایسے ہی رافضی قرار نہیں دے دیا، بلکہ دلائل و شواہد کی

روشنی میں یہ فیصلہ کیا ہے، ان کا یہ اعتراض بھی رافضیت کا پروردہ ہے، ہم ہی نہیں کہتے، تقریباً آٹھ سو سال پہلے علامہ رازی (۶۰۶ھ) لکھ گئے ہیں:

زعم قدماء الروافض أن هذا القرآن قد غیر و بدل وزید فیہ ونقص عنه ، واحتجوا علیہ بأنہ لا مناسبة بین هذه الآية و بین ما قبلها ، ولو كان هذا الترتیب من اللہ تعالیٰ لما كان الأمر كذلك ...

”قدیم رافضیوں نے دعویٰ کیا تھا کہ قرآن کریم (نعوذ باللہ!) تغیر و تبدل اور کمی و بیشی کا شکار ہو گیا ہے، اس پر دلیل انہوں نے یہی پیش کی ہے کہ اس آیت اور پہلی آیات میں کوئی ربط نہیں ہے، اگر یہ ترتیب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی تو ایسا نہ ہوتا۔۔۔“ (التفسیر الکبیر للرازی: ۱۹۷/۱۶)

صاحب تفسیر اللباب لکھتے ہیں: قال بعض الرافضة عدم مناسبتها لما قبلها يدل على تغییر القرآن .. ”بعض رافضی لوگوں نے کہا ہے کہ ان آیات کا پہلی آیات سے ربط نہیں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں تغیر و تبدل ہو چکا ہے۔“ (تفسیر اللباب: ۱۰۲/۱۶)

پھر انہوں نے کئی طرح سے ثابت کیا ہے کہ یہ آیات اس حدیث میں موجود تفسیر کے مطابق بے ربط نہیں ہیں، بلکہ ان میں کمال درجہ کا ربط ہے، مثلاً علامہ رازی لکھتے ہیں: وهذا كما أن المدرّس اذا كان يلقي على تلميذه شيئاً ، فأخذ التلميذ يلتفت يميناً وشمالاً ، فيقول المدرّس في أثناء ذلك الدرس : لا تلتفت يميناً وشمالاً ، ثم يعود الى الدرس ، فاذا نقل ذلك الدرس مع هذا الكلام في أثناءه ، فمن لم يعرف السبب يقول : ان وقوع تلك الكلمة في أثناء ذلك الدرس غير مناسب ، لكن من عرف الواقعة علم من أنه حسن الترتيب ...

”یہ اسی طرح ہے کہ استاذ اپنے شاگرد کو کچھ سمجھا رہا ہو، لیکن شاگرد دائیں بائیں جھانکنے لگے، استاذ

دورانِ سبق ہی کہہ دے کہ دائیں بائیں مت جھانکو! جب یہ الفاظ بھی سبق کے ساتھ نقل (ریکارڈ) ہو جائیں تو جس آدمی کو سبب کا علم نہ ہوگا، وہ کہے گا کہ اس سبق کے درمیان یہ الفاظ بے ربط ہیں، لیکن جس کو واقعہ کا علم ہوگا، اسے معلوم ہو جائے گا کہ یہ (بے ربطی نہیں، بلکہ) حسن ترتیب ہے۔۔۔“ (تفسیر الرازی: ۱۰۲/۸۶)

اور بھی بہت سے ربط بیان کیے گئے ہیں، تفصیل کے لیے کتبِ تفسیر کی طرف مراجعت فرمائیں!

نکتہ لطیفہ : ایک نکتہ یہ بھی یاد رہے کہ رافضیوں کو قرآن کریم میں بے ربطی اسی لیے نظر

آئی کہ وہ اس کی تفسیر حدیث سے نہیں کرتے تھے، اگر اس حدیث کو مانتے تو یقیناً بات ان کی سمجھ میں آ جاتی اور وہ انکارِ قرآن سے بچ جاتے، معلوم ہوا کہ انکارِ حدیث انکارِ قرآن ہے، جو آج بھی ہو رہا ہے۔

تنبیہ : اعتراضات سے فارغ ہو کر میرٹھی صاحب نے انکارِ حدیث کی روشنی میں سورۃ

القیامہ کی ان آیات کی ”تفسیر“ کی ہے، جو کہ بالکل باطل اور بودی ہے، لیکن ہم ابھی اس سے کوئی تعرض نہیں کریں گے، کیونکہ جب بفضل اللہ ہم نے صحیح بخاری کی اس حدیث پر وارد کیے گئے ان کے تمام اعتراضات کے کافی و شافی جوابات دے دیئے ہیں تو ان کی ”تفسیر“ خود بخود ہی مردود ہو جائے گی، دوسری بات یہ ہے کہ وہ ہمارے موضوع، یعنی صحیح بخاری سے متعلق نہیں، تیسری بات یہ ہے کہ ابھی تک ان کی تفسیر نایاب ہے، امید ہے کہ عنقریب وہ منظر عام پر آ جائے گی، اللہ تعالیٰ نے موقع دیا تو ہم ان کی اس کتاب ”مفتاح القرآن“ کا ایک مستقل جواب لکھیں گے۔ انشاء اللہ!



الوداع

غلام مصطفیٰ ظہیر الرحمن پوری، حافظ ابو یحییٰ نور پوری

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ موسیٰ بن وردان سے فرماتے ہیں: **أَلَا أَعْلَمُكَ يَا ابْنَ أَخِي شَيْئًا عَلَّمَنِيهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَقُولُهُ عِنْدَ الْوَدَاعِ؟ قُلْتُ بَلَى، قَالَ: قُلْ: أَسْتَوْدِعُكُمْ اللَّهُ الَّذِي لَا تَضِيعُ وَدَائِعُهُ.** ”اے بھتیجے! کیا میں تمہیں وہ دعا نہ سکھاؤں جو مجھے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائی تھی کہ میں (کسی کو) الوداع کرتے وقت کہوں؟ (موسیٰ بن وردان کہتے ہیں) میں نے عرض کی، جی ضرور، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تو کہا کہ: **أَسْتَوْدِعُكُمْ اللَّهُ الَّذِي لَا تَضِيعُ وَدَائِعُهُ.** ”میں تمہیں اس اللہ کے حوالے کرتا ہوں، جس

کی امانتیں ضائع نہیں ہوتیں۔“ (مسند الامام احمد: ۴۰۳/۲، عمل اليوم والليلة لابن السني: ۵۰۴، واللفظ له، وسنده حسن)